خلافتِ راشدہ سے ملوکیّت تک

ابُو الاعلیٰ مودُودی

خلافتِ راشدہ جس کے امتیازی خصائص اور بنیادی اصول اس سے پہلے اِس سلسلۂ مضامین میں بیان کیے جا چکے ہیں، حقیقت میں محض ایک سیاسی حکومت نہ تھی، بلکہ نبوت کی مکمّل نیابت تھی یعنی اس کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ملک کا نظم ونسق چلاتے، امن قائم کرے اور سرحدوں کی حفاظت کرتی رہے، بلکہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں معلّم، مربّی اور مرشد کے وہ تمام فرائض انجام دیتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی حیاتِ طیّبہ میں انجام دیا کرتے تھے، اور اس کی یہ ذمّہ داری تھی کہ دار الاسلام میں دینِ حق کے پورے نظام کو اس کی اصلی شکل و روح کے ساتھ چلاتے، اور دنیا میں مسلمانوں کی پوری اجتماعی طاقت اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت پر لگا دے۔ اس بنا پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ صرف خلافتِ راشدہ ہی نہ تھی بلکہ خلافتِ مُرشِدہ بھی تھی۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے الفاظ اس کی انہی دونوں خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں، اور دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی شخص بھی اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ اسلام میں اصل مطلوب اِسی نوعیت کی ریاست ہے نہ کہ محض ایک سیاسی حکومت۔

اب ہم اختصار کے ساتھ اُن مراحل کا جائزہ لیں گے جن سے گزرتے ہوئے یہ خلافت آخرکار ملوکیّت میں تبدیل ہوئی، اور یہ بتائیں گے کہ اِس تغیّر نے مسلمانوں کی ریاست کو اسلام کے اصولِ حکمرانی سے کس قدر ہٹا دیا اور اس کے کیا اثرات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر مترتّب ہوئے۔

تغیّر کا آغاز اس تغیّر کا آغاز ٹھیک اُسی مقام سے ہوا جہاں سے اُس کے رُونما ہونے

کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ اپنی وفات کے قریب زمانے میں سب سے بڑھ کر جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ یہ بھی کہ کہیں اُن کا جانشین اپنے قبیلے اور اپنے اقرباء کے معاملہ میں اُس پالیسی کو نہ بدل دے جو انہوں نے اور اُن سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کر رکھی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے قبیلے اور خاندان کے کسی شخص کو حکومت کا کوئی عہدہ نہ دیا تھا، اور حضرت عمرؓ نے خود اپنے دس سال کے عہد میں بنی عدی کے صرف ایک شخص کو ایک چھوٹے سے عہدے پر مقرر کیا تھا[1]۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے میں قبائلی عصبیتوں کو سر اٹھانے کا کوئی موقع نہ ملا۔ انہیں خوف تھا کہ یہ پالیسی اگر بدل دی گئی تو سخت فتنے کی موجب ہو گی۔ اسی لیے انہوں نے اپنے تینوں متوقع جانشینوں — حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص — کو الگ الگ بلا کر ان کو وصیت کی تھی کہ اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط نہ کر دینا[2]۔ لیکن اُن کے بعد جب حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ اِس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ انہوں نے پے در پے بنی امیہ کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کیے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں[3]۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے انہوں نے کوفے کی گورنری پر اپنے ماں جائے بھائی ولید بن عُقبہ بن ابی مُعیط کو مقرر فرمایا اور اس کے بعد یہ منصب اپنے ایک اور عزیز سعید بن عاص کو دیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کو ان کی جگہ مامور کیا۔ حضرت عمرو بن عاص کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا۔ حضرت معاویہ سیّدنا عمر فاروق کے زمانے میں صرف دمشق کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اُن کی گورنری میں شام، فلسطین، اردن اور

[1] ابن عبدالبرؒ، الاستیعاب، جلد ۱، ص ۲۹۶ (دائرۃ المعارف حیدرآباد، طبع ثانی)۔

[2] طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۳۴۰-۳۴۱-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۴ طبع بیروت، ۱۹۵۷

[3] مثال کے طور پر انہوں نے افریقیہ کے مالِ غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) مروان کو بخش دیا۔ طبقات ابن سعد، جلد ۳، ص ۶۴۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۴۶۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر ۱۳۴۸ھ

لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔ پھر اپنے چچا زاد بھائی مروان بن الحکم کو انہوں نے اپنا سکرٹری بنا لیا جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے دروبست پر اس کا اثر و نفوذ قائم ہو گیا۔ اس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہو گئے۔

ان باتوں کا ردِّ عمل صرف عوام ہی پر نہیں اکابر صحابہ تک پر کچھ اچھا نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر جب ولید بن عُقبہ کوفے کی گورنری کا پروانہ لے کر حضرت سعد بن ابی وقّاص کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا "معلوم نہیں ہمارے بعد تو زیادہ دانا ہو گیا ہے یا ہم تیرے بعد احمق ہو گئے ہیں"۔ اس نے جواب دیا "ابو اسحاق برافروختہ نہ ہو، یہ تو بادشاہی ہے، صبح کوئی اس کے مزے لوٹتا ہے تو شام کوئی اور"۔ حضرت سعدؓ نے کہا "میں سمجھتا ہوں واقعی تم لوگ اسے بادشاہی بنا کر چھوڑو گے"۔[۳۲] قریب قریب ایسے ہی خیالات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی ظاہر فرمائے۔

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اپنے خاندان کے جن لوگوں کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے حکومت کے یہ مناصب دیئے، انہوں نے اعلیٰ درجے کی انتظامی اور جنگی قابلیتوں کا ثبوت دیا، اور ان کے ہاتھوں بہت سی فتوحات ہوئیں لیکن ظاہر ہے کہ قابلیت صرف انہی لوگوں میں نہ تھی۔ دوسرے لوگ بھی بہترین قابلیتوں کے مالک موجود تھے اور ان سے زیادہ خدمات انجام دے چکے تھے۔ محض قابلیت اس بات کے لیے کافی دلیل نہ تھی کہ خراسان سے لے کر شمالی افریقہ تک کا پورا علاقہ ایک ہی خاندان کے گورنروں کی ماتحتی میں دے دیا جاتا اور مرکزی سکرٹریٹ پر بھی اسی خاندان کا آدمی مامور کر دیا جاتا۔ یہ بات اوّل تو بجائے خود قابلِ اعتراض تھی کہ مملکت کا رئیس اعلیٰ جس خاندان کا ہو، مملکت کے تمام اہم عہدے بھی اسی خاندان کے لوگوں کو دے دیئے جائیں۔ مگر اس کے علاوہ چند اسباب اور بھی تھے جن کی وجہ سے اس صورتِ حال نے اور زیادہ بے چینی پیدا کر دی:

اوّل یہ کہ بنی امیہ کے جو لوگ دورِ عثمانی میں آگے بڑھائے گئے وہ سب طُلَقا میں سے

---

[۳۲] ابن عبدالبر، الاستیعاب، جلد ۲، ص ۶۰۴

تھے یعنی آخر وقت تک وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوتِ اسلامی کے مخالف رہے۔ فتح مکہ کے بعد حضور نے ان کو معافی دی اور وہ اسلام میں داخل ہوئے۔ فطری طور پر یہ بات کسی کو پسند نہ آسکتی تھی کہ سابقین اولین، جنہوں نے اسلام کو سربلند کرنے کے لیے جانیں لڑائی تھیں، اور جن کی قربانیوں ہی سے دین کو فروغ نصیب ہوا تھا، پیچھے ہٹا دیئے جائیں اور یہ طلقاء جو فتح کے بعد ایمان لائے تھے، امت کے سرخیل ہو جائیں۔

دوسرے یہ کہ اسلامی تحریک کی سربراہی کے لیے یہ لوگ موزوں بھی نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ وہ ایمان تو ضرور لے آئے تھے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت سے ان کو اتنا فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ان کے ذہن اور سیرت و کردار کی پوری قلب ماہیت ہو جاتی۔ وہ بہترین منتظم اور اعلیٰ درجہ کے فاتح ہو سکتے تھے، اور فی الواقع وہ ایسے ہی ثابت بھی ہوئے۔ لیکن اسلام محض ملک گیری و ملک داری کے لیے تو نہیں آیا تھا۔ وہ تو اولاً اور بالذّات ایک دعوتِ خیر و صلاح تھا جس کی سربراہی کے لیے انتظامی اور جنگی قابلیتوں سے بڑھ کر ذہنی و اخلاقی تربیت کی ضرورت تھی، اور اُس کے اعتبار سے یہ لوگ صحابہ و تابعین کی اگلی صفوں میں نہیں بلکہ پچھلی صفوں میں آتے تھے۔

تیسرے یہ کہ عملاً بھی ان سے جس کردار کا ظہور ہو رہا تھا وہ اُس دور کے پاکیزہ ترین اسلامی معاشرے میں کوئی اچھا اثر پیدا نہ کر سکتا تھا۔ مثال کے طور پر حضرت سعد بن ابی وقاص کی جگہ جس ولید بن عُقبہ کو کوفے کا گورنر مقرر کیا گیا تھا، اس کے انتظام سے اوّل اوّل اہلِ کوفہ بہت مطمئن ہوئے، مگر بعد میں یہ بات کھلی کہ وہ مے نوش ہے اور اس کے قصّے مشہور ہونے لگے۔ آخر کار ایک روز اس نے نشے کی حالت ہی میں لوگوں کو صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا "اور پڑھاؤں؟" یہ واقعہ حضرت عثمان تک پہنچا، اس پر شہادتیں پیش ہوئیں اور حضرت عثمان نے ولید کو چالیس کوڑے لگوا کر گورنری سے معزول فرما دیا۔[۲۰]

[۲۰] ابن عبدالبر، الاستیعاب، ج ۲، ص ۶۰۴۔ علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ اس کے نشے کی حالت

ان وجوہ سے حضرت عثمانؓ کی یہ پالیسی بڑے دُور رس اور خطرناک نتائج کی حامل تھی لیکن خاص طور پر دو چیزیں ایسی تھیں جو بالآخر سخت فتنہ انگیز ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے حضرت معاویہ کو ایک ہی صوبہ کی گورنری پر مسلسل ۱۶-۱۷ سال مامور رکھا، حالانکہ حضرت عمرؓ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ کسی شخص کو ایک ہی صوبہ کی حکومت پر زیادہ مدت تک نہ رکھتے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً ادل بدل کرتے رہتے تھے، اور یہی تدبر کا تقاضا بھی تھا۔ مگر حضرت معاویہؓ کے معاملہ میں حضرت عثمانؓ نے اسے ملحوظ نہ رکھا۔ وہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں چار سال سے دمشق کی ولایت پر مامور چلے آرہے تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اَیلہ سے سرحدِ روم تک اور الجزیرہ سے ساحل بحرِ ابیض تک کا پورا علاقہ ان کی ولایت میں جمع کر کے اپنے پورے زمانۂ خلافت (۱۲ سال) میں ان کو اسی صوبے پر برقرار رکھا[۱۶]۔ یہی چیز ہے جس کا خمیازہ آخرکار حضرت علیؓ کو بھگتنا پڑا۔ شام کا یہ صوبہ اُس وقت کی اسلامی سلطنت میں بڑی اہم جنگی حیثیت کا علاقہ تھا۔ اس کے ایک طرف تمام مشرقی صوبے تھے، اور دوسری طرف تمام مغربی صوبے۔ بیچ میں وہ اِس طرح حائل تھا کہ اگر اُس کا گورنر مرکز سے منحرف ہو جاتے تو وہ مشرقی صوبوں کو مغربی صوبوں سے بالکل کاٹ سکتا تھا۔ حضرت معاویہؓ اِس صوبے کی حکومت پر اتنی طویل مدت تک رکھے گئے کہ انہوں نے یہاں اپنی جڑیں پوری طرح جمالیں، اور وہ مرکز کے قابو میں نہ رہے بلکہ مرکز ان کے رحم و کرم پر منحصر ہو گیا۔

دوسری چیز جو اس سے زیادہ فتنہ انگیز ثابت ہوئی وہ خلیفہ کے سکرٹری کی اہم پوزیشن پر مروان بن الحکم کی ماموریت تھی۔ اِن صاحب نے حضرت عثمانؓ کی نرم مزاجی اور ان کے اعتماد

میں نماز پڑھانے اور زائد کم کہنے کا واقعہ مشہورٌ من روایۃ الثقات من نقل اھل الحدیث و الاخبار۔ نیز وہ لکھتے ہیں کہ اصمعی، ابوعبیدہ، ابن الکلبی وغیرہم کا بیان ہے کہ ولید بن عقبۃ کان فاسقًا شریب الخمر۔

[۱۶] طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۴۰۶۔ الاستیعاب، ج ۱، ص ۲۵۳۔ یہ علاقہ وہ ہے جس میں اب شام، لبنان، اردن اور اسرائیل کی چار حکومتیں قائم ہیں۔ ان چاروں حکومتوں کے مجموعی حدود تقریباً آج بھی وہی ہیں جو امیر معاویہ کی گورنری کے عہد میں تھے۔

سے فائدہ اٹھا کر بہت سے کام ایسے کیے جن کی ذمہ داری لامحالہ حضرت عثمانؓ پر پڑتی تھی، حالانکہ ان کی اجازت اور علم کے بغیر ہی وہ کام کر ڈالے جاتے تھے۔ علاوہ بریں یہ صاحب حضرت عثمانؓ اور اکابر صحابہ کے باہمی خوشگوار تعلقات کو خراب کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے تاکہ خلیفۂ برحق اپنے پرانے رفیقوں کے بجائے اِن کو اپنا زیادہ خیر خواہ اور حامی سمجھنے لگیں[۵]۔ یہی نہیں بلکہ متعدد مرتبہ انہوں نے صحابہ کے مجمع میں ایسی تہدید آمیز تقریریں کیں جنہیں طُلقاء کی زبان سے سننا سابقین اوّلین کے لیے بمشکل ہی قابلِ برداشت ہو سکتا تھا۔ اِسی بنا پر دوسرے لوگ تو درکنار خود حضرت عثمانؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ بھی یہ رائے رکھتی تھیں کہ حضرت عثمانؓ کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری مروان پر عائد ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے شوہرِ محترم سے صاف صاف کہا کہ "اگر آپ مروان کے کہے پر چلیں گے تو یہ آپ کو قتل کرا کے چھوڑے گا، اس شخص کے اندر نہ اللہ کی قدر ہے، نہ ہیبت نہ محبت[۸]۔"

دوسرا مرحلہ | حضرت عثمانؓ کی پالیسی کا یہ پہلو اگرچہ بہت سے لوگوں کو ناگوار تھا، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی خلافت میں خیر اس قدر غالب تھی، اور اسلام کی سربلندی کا اتنا بڑا کام اُن کے عہد میں ہو رہا تھا کہ عام مسلمان پوری مملکت میں کسی جگہ بھی ان کے خلاف بغاوت کا خیال تک دل میں لانے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک مرتبہ بصرے میں اُن کے گورنر سعید بن العاص کے طرزِ عمل سے ناراض ہو کر کچھ لوگوں نے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی بھی تو عوام نے ان کا ساتھ نہ دیا اور جب حضرت عثمانؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰ اشعری نے لوگوں کو بیعت کی تجدید کے لیے پکارا تو لوگ بغاوت کے علمبرداروں کو چھوڑ کر بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے[۹]۔ یہی وجہ ہے کہ جو مختصر سا گروہ اُن کے خلاف شورش برپا کرنے اٹھا اُس نے بغاوت کی دعوتِ عام

[۵] طبقات ابنِ سعد، ج ۵، ص ۳۶

[۸] الطبری، ج ۳، ص ۳۹۶-۳۹۷- البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۱۷۲-۱۷۳

[۹] طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۳۲-۳۳- الطبری، ج ۳، ص ۳۷۲۔

دینے کے بجائے سازش کا راستہ اختیار کیا۔

اس تحریک کے علمبردار مصر، کوفہ اور بصرے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے باہم خط و کتابت کر کے خفیہ طریقہ سے یہ طے کیا کہ اچانک مدینہ پہنچ کر حضرت عثمانؓ پر دباؤ ڈالیں۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست مرتب کی جو زیادہ تر بالکل بے بنیاد، یا ایسے کمزور الزامات پر مشتمل تھی جن کے معقول جوابات دیئے جا سکتے تھے اور بعد میں دیئے بھی گئے۔ پھر باہمی قرارداد کے مطابق یہ لوگ جن کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی، مصر، کوفہ اور بصرے سے بیک وقت مدینہ پہنچے۔ یہ کسی علاقے کے بھی نمائندے نہ تھے بلکہ سازباز سے انہوں نے اپنی ایک پارٹی بنائی تھی۔ جب یہ مدینہ کے باہر پہنچے تو حضرت علی، حضرت طلحہ، اور حضرت زبیر کو انہوں نے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، مگر تینوں بزرگوں نے ان کو جھڑک دیا، اور حضرت علیؓ نے ان کے ایک ایک الزام کا جواب دے کر حضرت عثمان کی پوزیشن صاف کی۔ مدینے کے مہاجرینؓ و انصار بھی، جو دراصل اُس وقت مملکتِ اسلامیہ میں اہلِ حل و عقد کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے ہمنوا بننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ مگر یہ لوگ اپنی ضد پر قائم رہے اور بالآخر انہوں نے مدینہ میں گھس کر حضرت عثمانؓ کو گھیر لیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عثمان خلافت سے دست بردار ہو جائیں۔ حضرت عثمان کا جواب یہ تھا کہ میں تمہاری ہر اُس شکایت کو دُور کرنے کے لیے تیار ہوں جو صحیح اور جائز ہو، مگر تمہارے کہنے سے میں معزول نہیں ہو سکتا[۱۰]۔ اس پر ان لوگوں نے ۴۰ روز تک ایک ہنگامۂ عظیم برپا کیے رکھا جس کے دوران میں ایسی ایسی حرکات اُن سے سرزد ہوئیں جو مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کی توہین کی، اور حضرت عائشہؓ یہ کہہ کر مدینہ سے مکہ چلی گئیں کہ اس طوفانِ بدتمیزی میں کیا میں بھی اپنی توہین کراؤں۔ آخر کار ان لوگوں نے ہجوم کر کے سخت ظلم کے ساتھ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ تین دن تک ان کا جسدِ مبارک تدفین سے محروم رہا،

---

[۱۰] طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۶۶

اور قتل کرنے کے بعد ظالموں نے ان کا گھر بھی لوٹ لیا[11]۔

یہ صرف حضرت عثمانؓ پر نہیں، خود اسلام اور خلافتِ راشدہ کے نظام پر ان لوگوں کا ظلمِ عظیم تھا۔ ان کی شکایات میں سے اگر کوئی شکایت وزنی تھی تو صرف وہی جس کا اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اُس کو رفع کرانے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو سکتی تھی کہ یہ لوگ مدینہ طیبہ کے انصار و مہاجرین اور خصوصاً اکابر صحابہ سے مل کر ان کے ذریعہ سے حضرت عثمانؓ کو اصلاح پر آمادہ کرتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوشش شروع بھی کر دی تھی اور حضرت عثمان نے اصلاح کا وعدہ بھی کر لیا تھا[12]۔ لیکن یہ لوگ ان کی معزولی پر اصرار کرنے لگے، حالانکہ ساری دنیائے اسلام کے خلیفہ کو صرف بصرہ و کوفہ و مصر کے دو ہزار آدمی، جو خود اپنے علاقوں کے نمائندے بھی نہ تھے، معزول کرنے یا اس سے معزولی کا مطالبہ کرنے کا قطعاً کوئی حق نہ رکھتے تھے۔ انہیں خلیفہ کے انتظام پر اعتراض کا حق ضرور تھا، وہ شکایات پیش کرنے کے بھی حق دار تھے، اور اپنی شکایات کے ازالے کا مطالبہ بھی وہ کر سکتے تھے۔ مگر یہ حق انہیں ہرگز نہ پہنچتا تھا کہ اہل حل و عقد نے اُس وقت کے دستورِ اسلام کے مطابق جس شخص کو خلیفہ بنایا تھا، اور جسے دنیا کے سب مسلمان خلیفہ مان رہے تھے، اس سے یہ چند آدمی کسی نمائندہ حیثیت کے بغیر محض اپنے اعتراضات کی بنیاد پر معزولی کا مطالبہ کریں، قطع نظر اس سے کہ ان کے اعتراضات وزنی ہوں یا غیر وزنی[13]۔

[11] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو الطبری جلد ۳، ص ۳۷۶ تا ۴۱۸۔ البدایہ والنہایہ جلد ۷، ص ۱۶۸ تا ۱۹۱۔

[12] الطبری، ج ۳، ص ۳۷۶-۳۷۷-۳۸۴-۳۸۵۔ البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۱۷۱-۱۷۲۔

[13] یہی بات حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عثمان سے کہی تھی۔ جب شورش برپا کرنے والوں کی طرف سے معزولی کا مطالبہ شدت پکڑ گیا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا "آپ مسلمانوں پر یہ دروازہ نہ کھولیں کہ جب کچھ لوگ اپنے امیر سے ناراض ہوں تو اسے معزول کر دیں" (طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۶۶)۔ پھر یہی بات حضرت عثمانؓ نے مطالبۂ عزل کا جواب دیتے ہوئے محاصرین سے فرمائی تھی کہ "کیا میں مسلمانوں کے مشورے کے بغیر تلوار کے زور سے ملک پر قابض ہوا ہوں کہ تم مجھے تلوار کے زور سے معزول کرنا چاہتے ہو؟" (طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۶۵)

پھر انہوں نے اِس زیادتی پر بھی بس نہ کیا، بلکہ تمام شرعی حدود سے تجاوز کر کے خلیفہ کو قتل کر دیا اور اُن کا گھر لوٹ لیا۔ حضرت عثمان کے جن کاموں کو وہ اپنے نزدیک گناہ سمجھتے تھے وہ اگر گناہ تھے بھی تو شریعت کی رُو سے کوئی شخص انہیں ایسا گناہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اس پر کسی مسلمان کا خون حلال ہو جاتے یہی بات حضرت عثمانؓ نے اپنی ایک تقریر میں ان سے فرمائی تھی کہ شریعت میں تو ایک آدمی چند متعیّن جرائم پر مستوجبِ قتل ہوتا ہے۔ مَیں نے ان میں سے کوئی جرم بھی نہیں کیا ہے۔ پھر کس بنا پر تم میرا خون اپنے لیے حلال کیے لے رہے ہو[14]۔ مگر جو لوگ شریعت کا نام لے کر اُن پر معترض تھے انہوں نے خود شریعت کا کوئی لحاظ نہ کیا اور اُن کا خون ہی نہیں، اُن کا مال بھی اپنے اوپر حلال کر لیا۔

اس مقام پر کسی شخص کو یہ شُبہ لاحق نہ ہو کہ اہلِ مدینہ ان لوگوں کے اس فعل پر راضی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اچانک مدینہ پہنچ گئے تھے اور انہوں نے اہم ناکوں پر قبضہ کر کے ایک حد تک اہلِ شہر کو بے بس کر دیا تھا[15]۔ علاوہ بریں وہاں کسی کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ لوگ قتل جیسے گناہِ عظیم کا واقعی ارتکاب کر بیٹھیں گے۔ مدینہ والوں کے لیے تو یہ انتہائی غیر متوقع حادثہ تھا جو بجلی کی طرح اُن پر گرا اور بعد میں وہ اس پر سخت نادم ہوتے کہ ہم نے مدافعت میں اتنی تقصیر کیوں کی[16]۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عثمان خود اس امر میں مانع تھے کہ ان کے اقتدار کو بچانے کے لیے مدینۃ الرسول میں مسلمان ایک دوسرے سے لڑیں۔ وہ تمام صوبوں سے فوجیں بلا کر محاصرین کی تکا بوٹی کرا سکتے تھے، مگر انہوں نے اس سے پرہیز کیا۔ حضرت زید بن ثابت نے ان سے کہا کہ تمام انصار آپ کی حمایت میں لڑنے کو تیار ہیں، مگر انہوں نے فرمایا کہ اما القتال فلا۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن الزبیر سے بھی انہوں نے کہا کہ مَیں لڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ان کے محل میں ۷۰۰ آدمی

---

[14] البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۱۷۹

[15] البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۱۹۷

[16] طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۷۱

لڑنے مرنے کے لیے موجود تھے، مگر انہیں بھی وہ آخر وقت تک روکتے ہی رہے[۴۹]۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انتہائی نازک موقع پر حضرت عثمانؓ نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک خلیفہ اور ایک بادشاہ کے فرق کو صاف صاف نمایاں کر کے رکھ دیتا ہے۔ ان کی جگہ کوئی بادشاہ ہوتا تو اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کوئی بازی کھیل جانے میں بھی اُسے باک نہ ہوتا۔ اُس کی طرف سے اگر مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، انصار و مہاجرین کا قتلِ عام ہو جاتا ازواجِ مطہرات کی توہین ہوتی، اور مسجدِ نبوی بھی مسمار ہو جاتی تو وہ کوئی پروا نہ کرتا۔ مگر وہ خلیفۂ راشد تھے۔ انہوں نے سخت سے سخت لمحوں میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا کہ ایک خدا ترس فرمانروا اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے کہاں تک جا سکتا ہے اور کس حد پر پہنچ کر اسے رُک جانا چاہیے۔ وہ اپنی جان دے دینے کو اس سے ہلکی چیز سمجھتے تھے کہ ان کی بدولت وہ حرمتیں پامال ہوں جو ایک مسلمان کو ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہونی چاہییں۔

تیسرا مرحلہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینے میں سراسیمگی پھیل گئی کیونکہ امت یکایک بے سردار اور مملکت بے سربراہ رہ گئی تھی۔ باہر سے آنے والے شورشی اور مدینہ کے مہاجرین و انصار اور تابعین دونوں اس پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحدِ روم سے یمن تک اور افغانستان سے شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی یہ اُمت اور مملکت چند روز بھی بے سَر کیسے رہ سکتی ہے۔ لامحالہ جلدی سے جلدی ایک خلیفہ کا انتخاب ہونا چاہیے تھا، اور یہ انتخاب بھی لازماً مدینے ہی میں ہونا چاہیے تھا، کیونکہ وہی مرکزِ اسلام تھا، اور یہیں وہ اہلِ حل و عقد موجود تھے جن کی بیعت سے اُس وقت تک خلافت منعقد ہوتی رہی تھی۔ اس معاملہ میں نہ تاخیر کی جا سکتی تھی، اور نہ مدینہ سے باہر دُور دراز کے دیار و امصار کی طرف رجوع کرنے کا کوئی موقع تھا۔ ایک خطرناک صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ فوری ضرورت تھی کہ کسی موزوں ترین شخصیت کو سربراہ بنایا جائے تاکہ اُمت اُس پر جمع ہو سکے اور وہ مملکت کو انتشار سے بچا سکے۔

اُس وقت اُن چھ اصحاب میں سے چار موجود تھے جن کو حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے

[۴۹] طبقات ابن سعد، ج ۳ ص ۷۰-۷۱

وقت امت کے مقدم ترین اصحاب قرار دیا تھا۔ ایک، حضرت علی۔ دوسرے، حضرت طلحہ۔ تیسرے، حضرت زبیر۔ چوتھے حضرت سعد بن ابی وقاص۔ ان میں سے حضرت علی ہر لحاظ سے پہلے نمبر پر تھے۔ شوریٰ کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے امت کی عام رائے معلوم کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا تھا کہ حضرت عثمان کے بعد دوسرے شخص جن کو امت کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل ہے، حضرت علی ہی ہیں[۱۸]۔ اس لیے یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ خلافت کے لیے انہی کی طرف رجوع کرتے۔ صرف مدینے ہی میں نہیں، پوری دنیائے اسلام میں دوسرا کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی طرف اس غرض کے لیے مسلمانوں کی نگاہیں اٹھتیں۔ حتیٰ کہ اگر آج کے رائج طریقوں کے مطابق بھی کوئی انتخاب کرایا جاتا تو لازماً عظیم اکثریت کے ووٹ انہی کو حاصل ہوتے۔ چنانچہ تمام معتبر روایتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور دوسرے اہل مدینہ ان کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ "یہ نظام کسی امیر کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، لوگوں کے لیے ایک امام کا وجود ناگزیر ہے، اور آج آپ کے سوا ہم کوئی ایسا شخص نہیں پاتے جو اس منصب کے لیے آپ سے زیادہ مستحق ہو، نہ سابق خدمات کے اعتبار سے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرب کے اعتبار سے۔" انہوں نے انکار کیا اور لوگ اصرار کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے کہا "میری بیعت گھر بیٹھے خفیہ طریقہ سے نہیں ہو سکتی، عام مسلمانوں کی رضا کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔" پھر مسجد نبوی میں اجتماع عام ہوا اور تمام مہاجرین و انصار نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صحابہ میں سے صرف ۱۷ یا ۲۰ ایسے بزرگ تھے جنہوں نے بیعت نہیں کی[۱۹]۔

---

[۱۸] البدایہ والنہایہ، جلد ۷، ص ۱۴۶۔

[۱۹] الطبری، جلد ۳، ص ۴۵۰-۴۵۲۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۷، ص ۲۲۵-۲۲۶۔ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ جنگِ صفین کے موقع پر ۸۰۰ سو ایسے اصحاب حضرت علیؓ کے ساتھ تھے جو بیعت الرضوان کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ (الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۲۳

اِس رُوداد سے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت علیؓ کی خلافت قطعی طور پر ٹھیک ٹھیک اُنہی اصولوں کے مطابق منعقد ہوئی تھی جن پر خلافتِ راشدہ کا انعقاد ہو سکتا تھا۔ وہ زبردستی اقتدار پر قابض نہیں ہوئے۔ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لیے برائے نام بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ لوگوں نے خود آزادانہ مشاورت سے ان کو خلیفہ منتخب کیا۔ صحابہ کی عظیم اکثریت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور بعد میں شام کے سوا تمام بلادِ اسلامیہ نے ان کو خلیفہ تسلیم کیا۔ اب اگر حضرت سعد بن عُبادہ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت مشتبہ نہیں ہوتی تو ۱۷ یا ۲۰ صحابہ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت علیؓ کی خلافت کیسے مشتبہ قرار پا سکتی ہے علاوہ بریں ان چند اصحاب کا بیعت نہ کرنا تو محض ایک منفی فعل تھا جس سے خلافت کے معاملے کی آئینی پوزیشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیا مقابلے میں کوئی دوسرا خلیفہ تھا جس کے ہاتھ پر انہوں نے جوابی بیعت کی ہو؟ یا ان کا کہنا یہ تھا کہ اب امت اور مملکت کو بے خلیفہ رہنا چاہیے؟ یا یہ کہ کچھ مدت تک خلافت کا منصب خالی رہنا چاہیے؟ اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی، تو محض ان کے بیعت نہ کرنے کے یہ معنی کیسے ہو سکتے ہیں کہ اکثریت اور عظیم اکثریت نے جس کے ہاتھ پر بیعت کی ہے وہ جائز طور پر فی الواقع خلیفہ نہیں بنا۔

اِس طرح امت کو یہ موقع مل گیا تھا کہ خلافتِ راشدہ کے نظام میں جو خطرناک رخنہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پیدا ہوا تھا وہ بھر جاتا اور حضرت علی پھر سے اس کو سنبھال لیتے۔ لیکن تین چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے اس رخنے کو نہ بھرنے دیا، بلکہ اسے اور زیادہ بڑھا کر ملوکیت کی طرف امت کو دھکیلنے میں ایک مرحلہ اور طے کرا دیا۔

ایک، حضرت علیؓ کو خلیفہ بنانے میں اُن لوگوں کی شرکت جو حضرت عثمان کے خلاف شورش برپا کرنے کے لیے باہر سے آئے ہوئے تھے —— اُن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بالفعل جرمِ قتل کا ارتکاب کیا اور وہ بھی جو قتل کے محرک اور اس میں اعانت کے مرتکب ہوئے۔ اور ویسے مجموعی طور پر اِس فساد کی ذمہ داری اُن سب پر عائد ہوتی تھی۔ خلافت

کے کام میں اُن کی شرکت ایک بہت بڑے فتنے کی موجب بن گئی۔ لیکن جو شخص بھی اُن حالات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا جو اُس وقت مدینہ میں درپیش تھے، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُس وقت ان لوگوں کو انتخابِ خلیفہ کے کام میں شریک ہونے سے کسی طرح باز نہیں رکھا جا سکتا تھا پھر بھی ان کی شرکت کے باوجود جو فیصلہ ہوا وہ بجائے خود ایک صحیح فیصلہ تھا اور اگر امت کے تمام با اثر اصحاب اتفاقِ رائے کے ساتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ مضبوط کر دیتے تو یقیناً قاتلینِ عثمان کیفرِ کردار کو پہنچا دیئے جاتے اور فتنے کی یہ صورت، جو بدقسمتی سے رونما ہو گئی تھی، بآسانی ختم کی جا سکتی تھی۔

دوسرے، بعض اکابر صحابہ کا حضرت علیؓ کی بیعت سے الگ رہنا ـــــــ یہ طرزِ عمل اگرچہ اُن بزرگوں نے انتہائی نیک نیتی کے ساتھ محض فتنے سے بچنے کی خاطر اختیار فرمایا تھا، لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ جس فتنے سے وہ بچنا چاہتے تھے اُس سے بدرجہا زیادہ بڑے فتنے میں ان کا یہ فعل اُلٹا مددگار بن گیا۔ وہ بہرحال امت کے نہایت با اثر لوگ تھے۔ ان میں سے ہر ایک ایسا تھا جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا۔ ان کی علیحدگی نے دلوں میں شک ڈال دیئے اور خلافتِ راشدہ کے نظام کو ازسرِ نو بحال کرنے کے لیے جس دل جمعی کے ساتھ اُمت کو حضرت علی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے تھا، جس کے بغیر وہ اِس کام کو انجام نہ دے سکتے تھے، وہ بدقسمتی سے حاصل نہ ہو سکی۔

تیسرے، حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اُٹھ کھڑے ہوئے، ایک طرف حضرت عائشہ اور حضرات طلحہ و زبیر، اور دوسری طرف حضرت معاویہ۔ ان دونوں فریقوں کے مرتبہ و مقام اور جلالتِ قدر کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ دونوں کی پوزیشن آئینی حیثیت سے کسی طرح درست نہیں مانی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کے دَور کا قبائلی نظام تو نہ تھا کہ کسی مقتول کے خون کا مطالبہ لے کر جو چاہے اور جس طرح چاہے اٹھ کھڑا ہو اور جو طریقہ چاہے اسے پُورا کرانے کے لیے استعمال

کرلے۔ یہ ایک باقاعدہ حکومت تھی جس میں ہر دعوے کے لیے ایک ضابطہ اور قانون موجود تھا۔ خون کا مطالبہ لے کر اُٹھنے کا حق مقتول کے وارثوں کو تھا جو زندہ تھے اور وہیں موجود تھے۔ حکومت اگر مجرموں کو پکڑنے اور ان پر مقدمہ چلانے میں واقعی دانستہ ہی تساہل کر رہی تھی تو بلاشبہ دوسرے لوگ اس سے انصاف کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ لیکن کسی حکومت سے انصاف کے مطالبے کا یہ کونسا طریقہ ہے، اور شریعت میں کہاں اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے کہ آپ سرے سے اُس حکومت کو جائز حکومت ہی اُس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ آپ کے اِس مطالبہ کے مطابق عمل درآمد نہ کر دے۔ حضرت علیؓ اگر جائز خلیفہ تھے ہی نہیں تو پھر ان سے اس مطالبہ کے آخر معنی کیا تھے کہ وہ مجرموں کو پکڑیں اور سزا دیں؟ کیا وہ کوئی قبائلی سردار تھے جو کسی قانونی اختیار کے بغیر جسے چاہیں پکڑ لیں اور سزا دے ڈالیں؟ اس سے بھی زیادہ غیر آئینی طریقِ کار یہ تھا کہ پہلے فریق نے بجائے اس کے کہ وہ مدینے جا کر اپنا مطالبہ پیش کرتا جہاں خلیفہ اور مجرمین اور مقتول کے ورثاء سب موجود تھے اور عدالتی کارروائی کی جا سکتی تھی، بصرے کا رُخ کیا اور فوج جمع کر کے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی کوشش کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ ایک خون کے بجائے دس ہزار مزید خون ہوں، اور مملکت کا نظام الگ درہم برہم ہو جائے۔ شریعتِ الٰہی تو درکنار، دنیا کے کسی آئین و قانون کی رُو سے بھی اسے ایک جائز کارروائی نہیں مانا جا سکتا۔ اور اس سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرزِ عمل دوسرے فریق، یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا جو معاویہ بن ابی سفیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لیے اٹھے، مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا، گورنری کی طاقت اپنے اس مقصد کے لیے استعمال کی، اور مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمان پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دیں، بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلینِ عثمان کو ان کے حوالہ کر دیں تاکہ وہ خود انہیں قتل کریں[۲۰]۔ یہ سب کچھ دورِ اسلام کی نظامی حکومت کے بجائے زمانۂ قبلِ اسلام کی قبائلی بدنظمی سے اشبہ ہے۔ خونِ

---

[۲۰] الطبری، جلد ۴، ص ۳-۴۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۴۸۔ البدایہ والنہایہ، ج ۷، ۲۵۷-۲۵۸

عثمانؓ کے مطالبے کا حق اوّل تو حضرت معاویہؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بنا پر وہ یہ مطالبہ کرنے کے مجاز ہو بھی سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت میں نہ کہ شام کے گورنر کی حیثیت میں۔ حضرت عثمانؓ کا رشتہ جو کچھ بھی تھا، معاویہ بن ابی سفیان سے تھا۔ شام کی گورنری ان کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو گرفتار کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ گورنر کی حیثیت سے انہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی، جس کی خلافت کو اُن کے زیرِ انتظام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی،[۱] اس کی اطاعت سے انکار کر دیتے، اور اپنے زیرِ انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے میں استعمال کرتے، اور ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرتے کہ قتل کے ملزموں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدّعیِ قصاص کے حوالہ کر دیا جائے تاکہ وہ خود ان سے بدلہ لے۔

چوتھا مرحلہ یہ تین رخنے تھے جن کے ساتھ حضرت علیؓ نے خلافتِ راشدہ کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے کر کام شروع کیا۔ ابھی انہوں نے کام شروع کیا ہی تھا اور شورش برپا کرنے والے دو ہزار آدمیوں کی جمعیت مدینے میں موجود تھی کہ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما چند دوسرے اصحاب کے ساتھ ان سے ملے اور کہا کہ ہم نے اقامتِ حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے

[۱] یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ جنگِ صفّین کے بعد تک پورا جزیرۃ العرب، اور شام کے مشرق اور مغرب میں دونوں طرف اسلامی سلطنت کا ہر صوبہ حضرت علیؓ کی بیعت پر قائم تھا اور صرف شام حضرت معاویہؓ کے زیرِ اثر ہونے کی بنا پر اُن کی اطاعت سے منحرف تھا۔ اس لیے صحیح آئینی پوزیشن یہ نہ تھی کہ دنیائے اسلام میں کوئی طوائف الملوکی برپا تھی جس میں کوئی کسی کی اطاعت کا پابند نہ تھا، بلکہ یہ تھی کہ مملکت میں ایک جائز، قانونی، مرکزی حکومت موجود تھی جس کی اطاعت تمام دوسرے صوبے کر رہے تھے اور صرف ایک صوبہ باغی تھا۔ (الطبری، جلد ۳، ص ۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴۔ ابن الاثیر، جلد ۳، ص ۱۳۷-۱۴۱-۱۴۲۔ البدایہ ج ۷، ص ۲۲۹-۲۵۱-)

اب آپ اُن لوگوں سے قصاص لیجیے جو حضرت عثمان کے قتل میں شریک تھے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "بھائیو، جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں، مگر میں اُن لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اِس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم اُن پر۔ کیا آپ حضرات اُس کام کی کوئی گنجائش کہیں دیکھ رہے ہیں جسے آپ کرنا چاہتے ہیں؟" سب نے کہا "نہیں"۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا "خدا کی قسم میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون پر آنے دیجیے تاکہ لوگوں کے حواس برجا ہو جائیں، خیالات کی پراگندگی دُور ہو اور حقوق وصول کرنا ممکن ہو جائے"[۲۲]۔

اس کے بعد یہ دونوں بزرگ حضرت علیؓ سے اجازت لیکر مکہ معظّمہ تشریف لے گئے اور وہاں امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مل کر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے لیے بصرہ و کوفہ سے، جہاں حضرت طلحہ و زبیر کے بکثرت حامی موجود تھے، فوجی مدد حاصل کی جائے۔ چنانچہ یہ قافلہ مکّہ سے بصرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ بنی امیہ میں سے سعید بن العاص اور مروان بن الحکم بھی ان کے ساتھ نکلے۔ مَرُّ الظَّہران (موجودہ وادی فاطمہ) پہنچ کر سعید بن العاص نے اپنے گروہ کے لوگوں سے کہا کہ "اگر تم قاتلینِ عثمان کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو ان لوگوں کو قتل کر دو جو تمہارے ساتھ اِس لشکر میں موجود ہیں" (اُس کا اشارہ حضرت طلحہ و زبیر وغیرہ بزرگوں کی طرف تھا، کیونکہ بنی امیّہ کا عام خیال یہ تھا کہ قاتلینِ عثمان صرف وہی نہیں ہیں جنہوں نے اُن کو قتل کیا، یا جو اُن کے خلاف شورش برپا کرنے کے لیے باہر سے آئے، بلکہ وہ سب لوگ جنہوں نے وقتاً فوقتاً حضرت عثمانؓ کی پالیسی پر اعتراضات کیے تھے، اور وہ سب لوگ بھی قاتلینِ عثمان ہی ہیں جو شورش کے وقت مدینہ میں موجود تھے مگر قتلِ عثمانؓ کو روکنے کے لیے نہ لڑے)۔ مروان نے کہا کہ "نہیں، ہم ان کو (یعنی طلحہ و زبیر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم) کو ایک دوسرے سے لڑائیں گے۔ دونوں میں سے جس کو بھی شکست ہو گی وہ تو یُوں

[۲۲] الطبری، ج ۳، ص ۴۵۸۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۰۰۔ البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۲۲۷-۲۲۸۔

ختم ہو جائے گا، اور جو فتح یاب ہوگا وہ اتنا کمزور ہو جائے گا کہ ہم بآسانی اس سے نمٹ لیں گے[۲۳]۔ اِس طرح اِن عناصر کو لیے ہوئے یہ قافلہ بصرے پہنچا اور اس نے عراق سے اپنے ہزار ہا حامیوں کی ایک فوج اکٹھی کر لی۔

دوسری طرف حضرت علیؓ، جو حضرت معاویہؓ کو تابع فرمان بنانے کے لیے شام کی طرف جانے کی تیاری کر رہے تھے، بصرے کے اس اجتماع کی اطلاعات سُن کر پہلے اِس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ لیکن بکثرت صحابہ اور ان کے زیرِ اثر لوگ جو مسلمانوں کی خانہ جنگی کو فطری طور پر ایک فتنہ سمجھ رہے تھے، اس مہم میں ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوئے[۲۴]۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی قاتلینِ عثمان، جن سے پیچھا چھڑانے کے لیے حضرت علیؓ موقع کا انتظار کر رہے تھے، اُس تھوڑی سی فوج میں جو حضرت علیؓ نے فراہم کی تھی، اُن کے ساتھ شامل رہے۔ یہ چیز اُن کے لیے بدنامی کی موجب بھی ہوئی اور فتنے کی موجب بھی۔ بصرے کے باہر جب اُمّ المومنین حضرت عائشہ اور امیر المومنین حضرت علیؓ کی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں، اُس وقت دردمند لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس بات کے لیے کوشاں ہوئی کہ اہلِ ایمان کے اِن دونوں گروہوں کو متصادم نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ ان کے درمیان مصالحت کی بات چیت قریب قریب طے ہو چکی تھی۔ مگر ایک طرف حضرت علیؓ کی فوج میں وہ قاتلینِ عثمان موجود تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر ان کے درمیان مصالحت ہو گئی تو پھر ہماری خیر نہیں، اور دوسری طرف ام المومنین کی فوج میں وہ لوگ موجود تھے جو دونوں کو لڑا کر کمزور کر دینا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے بے قاعدہ طریقے سے جنگ برپا کر دی اور وہ جنگِ جمل برپا ہو کر رہی جسے دونوں طرف کے اہلِ خیر روکنا چاہتے تھے[۲۵]۔

۲۳؎ طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۳۴-۳۵

۲۴؎ البدایہ، ج ۷، ص ۲۳۳

۲۵؎ البدایہ، ج ۷، ص ۲۳۷-۲۳۹

جنگِ جمل کے آغاز میں حضرت علیؓ نے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو پیغام بھیجا کہ میں آپ دونوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ دونوں حضرات تشریف لے آئے اور حضرت علیؓ نے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات یاد دلاکر جنگ سے باز رہنے کی تلقین کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت زبیر میدانِ جنگ سے ہٹ کر الگ چلے گئے اور حضرت طلحہ آگے کی صفوں سے ہٹ کر پیچھے کی صفوں میں جا کھڑے ہوئے[۲۶] لیکن ایک ظالم عمرو بن جرموز نے حضرت زبیرؓ کو قتل کر دیا، اور مشہور روایات کے مطابق، حضرت طلحہؓ کو مروان بن الحکم نے قتل کر دیا[۲۷]۔ بہر حال یہ جنگ برپا ہو کر رہی اور اس میں دونوں طرف کے دس ہزار آدمی شہید ہوئے۔

یہ تاریخِ اسلام کی دوسری عظیم ترین بدقسمتی ہے جو شہادتِ عثمانؓ کے بعد رونما ہوئی، اور اس نے امت کو ملوکیت کی طرف ایک قدم اور دھکیل دیا۔ حضرت علیؓ کے مقابلے میں جو فوج لڑی تھی وہ زیادہ تر بصرہ و کوفہ ہی سے فراہم ہوئی تھی۔ جب حضرت علیؓ کے ہاتھوں اس کے پانچ ہزار آدمی شہید اور ہزاروں آدمی مجروح ہوئے تو یہ امید کیسے کی جا سکتی تھی کہ اب عراق کے لوگ اُس یک جہتی کے ساتھ اُن کی حمایت کریں گے جس یک جہتی کے ساتھ شام کے لوگ حضرت معاویہؓ کی حمایت کر رہے تھے۔ جنگِ صفین اور اس کے بعد کے مراحل میں حضرت معاویہؓ کے کیمپ کا اتحاد اور حضرت علیؓ کے کیمپ کا تفرقہ بنیادی طور پر اسی جنگِ جمل کا نتیجہ تھا۔ یہ اگر پیش نہ آئی ہوتی تو پچھلی ساری خرابیوں کے باوجود ملوکیت کی آمد کو روکنا عین ممکن تھا۔ حقیقت میں حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے تصادم کا یہی نتیجہ تھا جس کے رونما

[۲۶] الطبری، ج ۳، ص ۵۱۴ - ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۲۲-۱۲۳ - البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۲۴۰- ۲۴۱ - ۲۴۷ - الاستیعاب، ج ۱، ص ۲۰۷ -

[۲۷] طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۲۲۳ - ج ۵، ص ۳۸ - ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۲۴ - ابن عبدالبر، الاستیعاب، ج ۱، ص ۲۰۷ - علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ ثقات میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت طلحہ کا قاتل مروان ہی ہے - البدایہ میں علامہ ابن کثیر نے بھی مشہور روایت اسی کو مانا ہے، ج ۷، ص ۲۴۷

ہونے کی توقع مروان بن الحکم رکھتا تھا اور اُس کی یہ توقع سو فی صدی پوری ہو گئی۔

حضرت علیؓ نے اس جنگ کے سلسلے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ ایک خلیفۂ راشد اور ایک بادشاہ کے فرق کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ انہوں نے اپنی فوج میں پہلے ہی یہ اعلان کر دیا کہ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کرنا، کسی زخمی پر حملہ نہ کرنا، اور فتح یاب ہو کر مخالفین کے گھروں میں نہ گھسنا۔ فتح کے بعد انہوں نے دونوں طرف کے شہداء کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور انہیں یکساں احترام کے ساتھ دفن کرایا۔ تمام مال جو لشکرِ مخالف سے ملا تھا اسے مالِ غنیمت قرار دینے سے قطعی انکار کر دیا اور بصرے کی جامع مسجد میں اس کو جمع کر کے اعلان فرما دیا کہ جو اپنا مال پہچان لے وہ لے جائے۔ لوگوں نے خبر اڑائی کہ علیؓ یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ بصرے کے مردوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیں۔ حضرت علیؓ نے فوراً اس کی تردید کی اور فرمایا "مجھ جیسے آدمی سے یہ اندیشہ نہ ہونا چاہیے۔ یہ سلوک تو کافروں کے ساتھ کرنے کا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جا سکتا"۔ بصرے میں داخل ہوئے تو ہر گھر سے عورتوں نے گالیوں اور کوسنوں کی بوچھاڑ کر دی۔ حضرت علیؓ نے اپنی فوج میں اعلان کیا کہ "خبردار، کسی کی بے پردگی نہ کرنا، کسی گھر میں نہ گھسنا، کسی عورت سے تعرض نہ کرنا، خواہ وہ تمہیں اور تمہارے امراء اور صلحاء کو گالیاں ہی کیوں نہ دیں۔ ہم کو تو ان پر دست درازی کرنے سے اس وقت بھی روکا گیا تھا جب یہ مشرک تھیں۔ اب ہم ان پر ہاتھ کیسے ڈال سکتے ہیں جبکہ یہ مسلمان ہیں"۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ، جو شکست خوردہ فریق کی اصل قائد تھیں، انتہائی احترام کا برتاؤ کیا اور پوری حفاظت کے ساتھ انہیں مدینہ بھیج دیا[۲۹]۔ حضرت زبیرؓ کا قاتل انعام پانے کی امید لیے ہوئے آیا، مگر آپ نے اس کو جہنم کی بشارت دی اور اس کے ہاتھ میں حضرت زبیرؓ کی تلوار دیکھ کر

۲۸؎ الطبری، ج ۳، ص ۵۰۶، ۵۱۰، ۵۴۲، ۵۴۴۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۲۲۔ ۱۳۱۔ ۱۳۴۔

البدایہ، ج ۷، ص ۲۴۴۔ ۲۴۵۔

۲۹؎ البدایہ، ج ۷، ص ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ الطبری، ج ۳، ص ۵۴۷

فرمایا "کتنی ہی مرتبہ اس تلوار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی ہے"[۳۰]۔ حضرت طلحہ کے صاحبزادے ملنے آئے تو بڑی محبت کے ساتھ ان کو اپنے پاس بٹھایا، ان کی جائداد ان کو واپس کی، اور فرمایا "مجھے امید ہے کہ آخرت میں تمہارے والد اور میرے درمیان وہی معاملہ پیش آئے گا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ[۳۱]" (ہم ان کے دلوں کی کدورت نکال دیں گے اور وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے"۔

(باقی)

---

[۳۰] البدایہ، ج ۷، ص ۲۴۹- ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۲۵

[۳۱] طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۲۲۴-۲۲۵

ضروری تصحیحات

(۱) ترجمان القرآن ماہ مارچ ۱۹۶۵ء میں صفحہ ۴۰ کے حاشیہ کی پہلی سطر غلط لکھی گئی ہے۔ موجودہ عبارت یہ ہے: "اور وہ غیر مسلم بھی جو مسلمانوں کے ہاں جنگ میں گرفتار ہو کر آتے اور فدیہ ادا کر کے حاصل ہونے کی کوشش کرتے تھے"۔ حالانکہ صحیح عبارت یوں ہے: "اور وہ غیر مسلم بھی جو مسلمانوں کے ہاں جنگ میں گرفتار ہو کر آتے اور مسلمان ہونے کے بعد فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے"۔

(۲) ترجمان القرآن، ماہ اپریل ۱۹۶۵ء میں صفحہ ۶۸ پر تیسرے پیراگراف کی عبارت یہ ہے: "بظاہر یہ سمجھنے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ خواب کی سچائی کا وقت سے کوئی خاص تعلق ہے"۔ ناظرین کرام اس کے بعد حسبِ ذیل فقرے کا اضافہ کریں: "البتہ ترمذی اور دارمی میں یہ روایت آئی ہے کہ صبح کے وقت نظر آنے والے خواب عموماً زیادہ سچے ہوتے ہیں"۔